# مولانا آزاد کے سیاسی افکار و عمل

ڈاکٹر خالد اشرف

ایسوسی ایٹ پروفیسر، کروڑی مل کالج، دہلی یونیورسٹی، دہلی، موبائل:8800489012، ای۔میل: khaliddu@gmail.com

مولانا محی الدین احمد، کنیت ابوالکلام، تخلص آزاد، مکہ میں نومبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد بنگالی اور والدہ عرب تھیں، گویا یا زبان عربی اُن کو ورثہ میں ملی تھی اور اردو و انگریزی اکتسابی زبانیں تھیں۔ پندرہ برس کی عمر میں عربی و فارسی میں مہارت حاصل کرنے کے بعد جامعہ الازہر، قاہرہ میں درس لیے اور ۱۹۲۰ء میں کلکتے واپس آ کر صحافت کے کوچے میں قدم رکھا۔ گھر کا ماحول بے حد مذہبی اور خشک تھا، لیکن مولانا کے مزاج میں روایت شکنی اور رنگینی پیدا ہونے لگی تھی۔ انھوں نے ایک نامکمل فلم کی کہانی لکھی اور کچھ شاعری بھی کی۔ اُن کا ایک شعر تو ضرب المثل بن گیا تھا:

آزاد بے خودی کے نشیب و فراز دیکھ
پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی

لیکن مولانا کا اصل میدان تحریکِ آزادی اور قوم پرستانہ سیاست قرار پایا۔ گو کہ علمی مشاغل بھی پہلو بہ پہلو جاری رہے۔ اُن کی پہلی علمی کاوش 'تفسیر القرآن' ہے جس کی جلد اوّل ۱۹۳۰ء میں شائع ہوئی۔ تفسیر کے دیباچے میں مولانا آزاد نے لکھا تھا:

''۱۹۱۵ء میں جب میں نے اس کام کا ارادہ کیا تو بیک وقت تین چیزیں پیشِ نظر تھیں۔ ترجمہ، تفسیر اور مقدمہ تفسیر۔ میں نے خیال کیا تھا کہ یہ تین کتابیں قرآن کے فہم و مطالعے کی تین مختلف ضرورتیں پوری کر دیں گی۔ عام تعلیم کے لیے ترجمہ مطالعے کے لیے تفسیر، اہلِ علم و نظر کے لیے مقدمہ۔''

''دیباچہ تفسیر القرآن، جلد اوّل دہلی، ۱۹۸۲ء، ص:۱۷''

لیکن مولانا کی ترجمان القرآن دو جلد سے آگے نہ بڑھ سکی اور زیادہ تر علماء نے اس کو توضیحی ترجمہ قرار دیا۔ مولانا کی معیاری زبان، دلکش پیرایۂ بیان اور باوقار اسلوب کے مدِنظر سجاد مہدی نے 'محشرِ خیال' میں لکھا تھا:

''میرا عقیدہ ہے کہ اگر قرآن نازل نہ ہو چکا ہوتا اور اردو میں نازل ہوتا تو اس کے لیے یا تو اقبال کی شاعری منتخب کی جاتی یا ابوالکلام کی نثر۔''

مولانا آزاد اوّل تا آخر اردو کے ادیب اور مفکر تھے۔ وہ اپنے مذہبی اور سیاسی افکار کا تمام تر اظہار اردو ہی میں کرتے تھے۔ وہ اردو کے حامی اور شیدا تھے۔ تاہم ان کا ذہن ہندوستان کی دوسری زبانوں کے لیے بند نہیں تھا۔ انھوں نے ہندوستانی کمیٹی، بہار کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۷ء میں قومی زبان کے نزاعی سوال پر ملک کی ملی جلی زبان (اردو) کی بقا اور فروغ کی حمایت کی تھی، لیکن یہ بھی کہا تھا کہ یوروپ کے بعض ممالک نے ایک سے زائد زبانوں کو قومی زبانوں کا درجہ دے کر اس مسئلے کو حل کیا ہے، چنانچہ یہی کام ہندوستان میں بھی ہوسکتا ہے۔ اسی طرح جب صوبۂ سرحد میں حکومت نے پنجابی زبان کے خلاف سرکلر جاری کیا تو مولانا نے جنوری ۱۹۳۷ء میں غلام رسول کو لکھے گئے ایک خط میں اس اقدام کی مذمت کی اور کہا تھا کہ صوبۂ سرحد میں پنجابی زبان بولنے اور پڑھنے والوں کو اپنی مادری زبان پڑھنے اور بولنے کی سہولت ملنی چاہیے، ورنہ اردو کی تحریک کو فائدہ نہیں نقصان بھی ہوگا۔

۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نے مولانا آزاد کے علمی تبحر کے مدِنظر ان کو ندوۃ العلماء کے ادارۂ تحریر میں شامل کیا، جہاں مولانا صرف سات ماہ تک رہ سکے اور 'الندوہ' کی ادارت میں حصّہ لیا۔

مولانا کے ادبی و علمی مضامین گیارہ برس کی عمر سے شائع ہونے لگے تھے۔ جولائی ۱۹۱۲ء میں انھوں نے ہفت روزہ 'الہلال' جاری کیا، جس کے لیے ٹائپ کے ڈھلے ہوئے حروف یوروپ اور ترکی وغیرہ سے منگوائے تھے۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں حکومت نے 'الہلال' کی ضمانت ضبط کر لی، کیونکہ یہ اخبار انگریزی تسلط کے خلاف لکھ رہا تھا۔ ستمبر ۱۹۱۴ء کے 'الہلال' میں مولانا نے صاف صاف لکھا تھا:

''ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے، لیکن مسلمانوں کے لیے ایک دینی فرض ہے اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔ اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے

اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق وصداقت اور 'انسانی استبداد اور غلامی کو توڑنے کے لیے ہے۔''

ظاہر ہے کہ اس نوعیت کی واشگاف سیاسی مخالفت برٹش حکومت پسند نہیں کر سکتی تھی، چنانچہ 'الہلال' کو بند کر دیا گیا۔ ڈھائی برس کے بعد مولانا آزاد نے کچھ سرمایہ فراہم کر کے نومبر ۱۹۱۵ء میں 'الہلال' جاری کیا جو مارچ ۱۹۱۶ء میں 'الہلال' ہی کی طرح تعزیر اور پابندی کا شکار ہوا۔ جون ۱۹۲۷ء میں از سرِ نو 'الہلال' کی تجدید کی تو آزادی کے متوالوں میں ایک نیا تحرک پیدا ہوا۔ اپنی صحافت کو مولانا نے مسلمان قوم کو مسلم لیگی علیحدگی پسندی کے رجحان سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور کانگریس پارٹی کے مشترکہ قومی محاذ میں شامل کرنے کے سیکولر مشن کو اپنایا۔

جب یکے بعد دیگرے 'الہلال' اور 'البلاغ' سرکاری عقاب کے شکار ہو کر دم توڑ گئے اور مولانا آزاد کو بنگال بدر کر کے رانچی میں نظر بند کر دیا گیا تو وہ اپنے اسلاف کی تاریخ پر کام کرنے لگے، جس کو اُن کے ایک مداح فضل الدین احمد نے نامکمل حالت ہی میں 'تذکرہ' کے عنوان سے شائع کر دیا تھا، جو آج تک ساہتیہ اکادمی کے ذریعہ اسی طرح طبع ہوتا رہتا ہے۔ سیاسی و ادبی نقطۂ نظر سے 'تذکرہ' اہم نہیں ہے، کیونکہ اس میں مولانا نے تمام تر زورِ قلم ماضی پر صرف کیا تھا۔

۱۹۰۵ء میں جب بنگال تقسیم ہوا تو وہاں کے ہندو زمینداروں کو زیادہ نقصان پہنچا۔ چنانچہ وہاں بہت سی انقلابی تنظیمیں پیدا ہو گئیں جنھوں نے انگریزوں کے خلاف پر تشدد گوریلا تحریکیں چلائیں اور حکومت کو 'بنگ بھنگ' کی تنسیخ کرنے پر مجبور کر دیا۔ مولانا آزاد نے ان انقلابی گروہوں سے مراسم استوار کیے، لیکن ان انقلابیوں نے مولانا کو اپنے حلقۂ مخصوص میں شامل نہیں کیا کیونکہ یہ انقلابی اصلاً ہندو احیا پرست تھے اور مولانا پر مکمل اعتماد نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد مولانا عراق، مصر اور ترکی وغیرہ کے اسفار پر گئے جہاں پان۔ اسلامی نظریات کے حامیوں: ملّا جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہ وغیرہ سے تبادلۂ خیال رہا۔

یہاں تک آتے آتے مولانا اپنا سیاسی نظریہ مرتب کر چکے تھے۔ یہ نظریہ ۱۹۰۶ء میں نوابین کے ذریعہ قائم کی گئی مسلم لیگ کا بھی نہیں تھا اور نہ ہی جمال الدین افغانی اور شوکت علی، محمد علی کا Pan-Islamic مکتبِ فکر تھا، بلکہ گاندھی، نہرو کا مشترکہ قومیت والا اور انگریز مخالف حریت پسندی کا نظریہ تھا۔ مولانا نے دسمبر ۱۹۱۲ء کے ایک مضمون میں قوم کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا:

''جو ہونے والا ہے، اُس کو کوئی قدم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی بیڑیاں جو اس نے خود اپنے پاؤں میں ڈال لی ہیں، بیسویں صدی کی ہوائے حُرّیت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو چکا ہوگا، جس کا ہونا ضرور ہے۔'' (الہلال، ۸؍دسمبر ۱۹۱۲ء)

'الہلال' اور 'البلاغ' کے دم توڑنے اور مولانا کے رانچی میں نظر بند ہونے کے بعد وہ کانگریس کی تحریک میں دامے درمے قلمے سخنے شامل ہو گئے اور ترکِ موالات میں گرفتار ہوئے، پھر جنوری ۱۹۲۳ء میں رہا ہوئے۔ ستمبر میں کانگریس کے دو متحارب گروپوں کے درمیان مفاہمت کرانے میں کامیاب ہوئے اور پارٹی کے صدر منتخب ہوئے۔ چونکہ مسلم لیگ اور علی گڑھ کے اکابرین و عمائدین مولانا آزاد کے نظریۂ مشترکہ تہذیب Composite Culture سے 'متفق نہیں تھے' بہت سے چھوٹے بڑے مولویوں اور مسلم سیاسئین نے مولانا پر طعن و تشنیع کا سلسلہ شروع کر دیا اور اُن کو کانگریس پارٹی کا 'Show Boy' کہا جانے لگا۔

دراصل مولانا آزاد کے زمانے کے ہندوستان میں سیاسی فکر کے تین دھارے متوازی چل رہے تھے۔ پہلا دھارا کانگریس کا سیکولرزم اور مشترکہ قومیت کا تھا، دوسرا بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور اشفاق اللہ خان وغیرہ کا انقلابی جدوجہد کا تھا اور تیسرا بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے، ویر ساورکر، ڈاکٹر مونجے کی ہندو تہذیب بنام مولانا شبلی، مولانا شوکت علی، محمد علی جناح اور مولانا مودودی وغیرہ کا اسلامی برتری والا تھا، جن کے باہمی ٹکراؤ کو اکھنڈ بھارت اور تصویرِ پاکستان کے تضاد کی شکل میں دیکھا جا سکتا ہے۔

پاکستان کے ابتدائی نظریہ سازوں میں عبدالرحیم خواجہ، علامہ اقبال اور چودھری رحمت علی وغیرہ تھے۔ علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں وسیع تر ہندوستان کے ایک خود مختار Autonomous علاقے کے طور پر تشکیل پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں انگلینڈ میں چودھری رحمت علی ہوشیار پوری نے ایک پمفلٹ میں پاکستان بطور ایک آزاد ملک کا مطالبہ کیا۔ مارچ ۱۹۳۴ء میں قائدِاعظم محمد علی جناح آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۴۰ء تک آتے آتے پاکستان بطور ایک آزاد اسلامی مملکت کا مطالبہ مسلم لیگ کی قرارداد کی شکل میں لاہور میں منظور ہو گیا، گو کہ لیگ ابھی تک مسلمانوں کی نمائندہ جماعت نہ بن سکی تھی۔

جب ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت صوبوں میں

الیکشن ہوئے تو کانگریس نے گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں جیت کر وزارتیں بنائیں۔ تاہم جب ۱۹۳۹ء میں ہندوستانی عوام اور سیاسی رہنماؤں کی مرضی کے خلاف ملک کو جنگِ عظیم میں جھونک دیا، تو بطورِ احتجاج کانگریس نے آٹھوں صوبوں میں وزارتوں سے استعفیٰ دے دیا تھا، لیکن ملک میں جیسے جیسے تحریک آزادی زور پکڑ رہی تھی، اُسی کے پہلو بہ پہلو فرقہ پرست طاقتیں بھی سیاست و معاشرت میں علیٰحدہ قومیت کے زہر پھیلاتی جارہی تھیں۔ مولانا آزاد اس خطرے سے آگاہ تھے اور انھوں نے بار بار اعلان کیا کہ ان کو ملک کی ایسی آزادی نہیں چاہیے جس سے ہندو۔ مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوجائے۔ بلکہ وہ صرف ایسی آزادی کے خواہشمند تھے جس کے حصول میں قومی اتحاد قائم رہ سکے۔ جب ۲۳/ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائداعظم کی سرکردگی میں قراردادِ پاکستان منظور ہوئی تو اس پس منظر میں سترہ سال بعد مولانا آزاد کو رام گڑھ اجلاس کا دوبارہ صدر منتخب کرکے انڈین نیشنل کانگریس کی لیڈرشپ نے برٹش اقتدار اور ملک کے ہندو۔ مسلمانوں کو پیغام دیا کہ ملک کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی اپنے سیکولر نظریے کا بانگ دُہل اعلان کرتی ہے۔

چنانچہ ۲۰/ مارچ کو رام گڑھ اجلاس میں اپنی صدارتی تقریر میں مولانا نے جو الفاظ دوہرائے، وہ نہ صرف ان کے ذاتی نظریات کے عکاس تھے، بلکہ گاندھی، نہرو، آزاد کی انڈین نیشنل کانگریس کا عہدنامہ بھی تھا۔ اس موقع پر مولانا نے علی الاعلان کہا تھا:

> ''میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں....لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں.....میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں۔ میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین کا ایک ناگزیر عامل ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہوسکتا۔'' (خطباتِ آزاد، نئی دہلی، ۱۹۹۷ء ص: ۲۹۷)

اسی اجلاس میں مولانا نے اعلان کیا تھا کہ آزادی کے حصول کے بعد ہندوستان ایک وفاقی جمہوریہ بنے گا، جہاں اقلیتوں کی جان و مال اور مذہبی وثقافتی شناخت کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہوگا، لیکن ایسا ہوانہیں!

اس تقریر کے بعد مولانا پانچویں دفعہ گرفتار کرلیے گئے۔ پھر ۸/ اگست ۱۹۴۲ء کو بمبئی کے آزاد میدان میں کانگریس نے 'بھارت چھوڑو' کی تحریک شروع کردی اور گاندھی جی نے 'Do or Die' کی صدائے عام دی تو مولانا آزاد اور جواہر لعل نہرو سمیت تمام سرکردہ کانگریسی گرفتار کرلیے گئے اور احمد نگر قلعے میں مقید کردیے گئے۔ اسی دوران مولانا نے 'غبارِ خاطر' (۱۹۴۶ء) کے خطوط نما انشائیے تحریر کیے تھے۔ قید کے دوران ان کی بیوی زلیخا بیگم کا انتقال ہوا اور ان کی صحت کافی خراب ہوگئی۔ پندرہویں جون ۱۹۴۵ء کو کانگریس کے واحد نمائندے کے طور پر شملہ کانفرنس میں شرکت کی۔ دوسری جنگِ عظیم میں ہٹلر وغیرہ کی کمر ٹوٹ چکی تھی، مگر فتح یاب ہونے کے باوجود برطانیہ کی معیشت بھی لڑکھڑا گئی تھی اور اب ہندوستان کو مزید غلام بنائے رکھنا اس کے لیے تقریباً ناممکن ہوگیا تھا۔ اُدھر لندن میں ایٹلی کی سرکردگی میں لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آگئی تھی جو ہندوستان کو آزاد کرنے کا اعلان کرچکی تھی۔ مولانا آزاد ہی نے اس سلسلے میں پیش رفت کے لیے کرپس مشن اور کابینہ مشن سے بطور کانگریس صدر مذاکرات کیے۔

مولانا قدم قدم پر مطالبۂ پاکستان کو مسترد کرتے رہے، لیکن جنوری ۱۹۴۶ء میں مرکزی اور صوبائی انتخابات میں مسلم لیگ نے مرکز کی تمام مسلم سیٹوں پر کامیابی حاصل کی اور صوبوں میں ۴۹۴ مسلم نشستوں میں سے ۴۳۹ نشستیں حاصل کرلیں گویا تشکیل پاکستان کا راستہ ہموار ہوگیا، لیکن مولانا اس کے خلاف جذباتی طور پر نہایت سخت رہے اور جب وائسرائے ماؤنٹ بٹن نے ملک کی تقسیم کا مقدمہ تیار کرلیا تو مولانا آزاد سمیت تمام کانگریسی رہنماؤں نے اس تقسیم کی مخالفت کی، مگر:

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ سب اُسی کافر کے ہو گئے

کے مصداق پہلے سردار پٹیل، پھر جواہر لعل اور پھر گاندھی جی، جنھوں نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان ان کی لاش کے اوپر ہی بن سکے گا، وہ بھی سردار پٹیل سے ملاقات کے بعد پاکستان کی مخالفت چھوڑ بیٹھے۔ دراصل مشترکہ عبوری حکومت میں بطورِ وزیر خزانہ نواب لیاقت علی خاں نے کانگریس کے وزرا، بالخصوص وزیر داخلہ سردار پٹیل کو اس درجہ ستایا تھا کہ وہ دوقومی نظریے کے حامی بن گئے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی خودنوشت 'India Wins Freedom' کے تیس صفحات (مطبوعہ ۱۹۸۸ء) میں

صاف صاف لکھا تھا:

"I was surprised and pained when Patel in reply said that whether we liked it or not, there were two nations in India. He was now convineed that Muslims and Hindus could not be united into one nation."

(India wins freedom: The complete version, 2014, P.201)

چنانچہ ماؤنٹ بٹن کا منصوبہ جو دراصل برٹش حکومت کی 'پھوٹ ڈالو اور راج کرو' کی پرانی پالیسی کا زائیدہ تھا، کامیاب ہوگیا اور لاکھوں ہندو۔ مسلم اور سکھ تقسیم کے مساوات میں قتل ہوئے، گھروں سے اُجاڑے گئے اور اپنے گاؤں اور گھر چھوڑ نے پر مجبور ہوئے۔ تیسویں جنوری ۱۹۴۸ء کو گاندھی جی قتل ہوئے اور گیارہ ستمبر کو گورنر جنرل مملکت پاکستان محمد علی جناح بھی فوت ہوگئے۔

مولانا آزاد نے اسی خودنوشت میں اپنی دو غلطیوں کا اعتراف کیا تھا:

۱۔ جب اپریل ۱۹۴۶ء میں انھوں نے چند کانگریسی رہنماؤں کی در پردہ مخالفت کے مدِّنظر کانگریس کی صدارت سے استعفیٰ دیا اور جواہر لعل کو نامزد کرکے کرسیِ صدارت تک پہنچا دیا۔ اس غلطی کا احساس مولانا کو اُس وقت ہوا، جب جواہر لعل، لیڈر ماؤنٹ بٹن کی شیریں زبانی کے زیرِ اثر تقسیم کے لیے راضی ہوگئے۔ دراصل وہ حکومتِ برطانیہ کے ایجنڈے پر کام کر رہی تھی۔

۲۔ کانگریس پارٹی کی صدارت ہی سے متعلق دوسری غلطی کا اعتراف مولانا نے یہ کیا تھا کہ دوبارہ صدارت کے لیے کھڑے نہ ہوکر اور سردار پٹیل کی حمایت نہ کرکے زندگی کی دوسری بڑی غلطی کی تھی۔

مولانا کے یہ اعترافات بجا، لیکن یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد کے گیارہ برسوں میں انھوں نے ہندوستان میں جو ادارے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز، کونسل فار سائنٹفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ، ساہتیہ اکادمی، سنگیت ناٹک اکادمی، للت کلا اکادمی، یونیورسٹیاں، کالج اور آئی آئی ٹی وغیرہ قائم کیے، اُن کا ذکر سنہرے الفاظ میں لکھے جانے کے لائق ہے۔ تقسیم کے بعد جب فرقہ پرستوں کے خوف سے مسلمان سہمے ہوئے تھے اور جبری ہجرت کر رہے تھے، مولانا نے ۲۴ ؍اکتوبر ۱۹۴۷ء کو دلّی کی شاہجہانی مسجد میں جو خطبہ دیا تھا، اُن کی تاریخی فہم اور مستقبل شناسی کا سب سے مستند ثبوت ہے۔

بلاشبہ تقسیم ہند کا سانحہ مولانا آزاد کے لیے بڑا جانکاہ تھا، لیکن جواہر لعل کے شانہ بشانہ انھوں نے ملک کی تعلیمی و ثقافتی تعمیر و ترقی جو جانفشانی کی، وہ قابل تحسین ہے۔ موجودہ انتشار کی فضا میں مولانا آزاد کا سیکولر وژن اور مشترکہ ہندو۔ مسلم ثقافتی پروجیکٹ ملک کے ادیبوں، فنکاروں اور دانشوروں کو فکر و عمل کی دعوت دے رہا ہے۔

◆◆◆


## ابن صفی: شخصیت اور فن کے آئینے میں

اردو ادب میں ابن صفی کی گراں قدر خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں مگر ان کی خدمات کا اعتراف بہت کم ہوا ہے۔ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام ذہنی تحفظات سے بلند ہوکر معروضی انداز میں ان کے ادبی مقام کا تعین کیا جائے تاکہ نئی نسلیں ان کی تخلیقی فتوحات سے واقف ہوسکیں اور ان کے لائقِ رشک طرزِ نگارش، غیر معمولی حسِ مزاح، ذہانت، ذکاوت اور حیرت انگیز زود نویسی کے باوصف فکر و فن کی تازگی کو برقرار رکھنے کی زبردست صلاحیت کا ادراک و احساس کرسکیں۔ ایسے ہر دلعزیز تخلیق کار کا کھلے دل سے اعتراف کرنے کے لیے اردو اکادمی، دہلی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اشتراک سے ایک سمینار کا انعقاد کیا گیا تھا۔ اس سمینار کے بیس فکر انگیز مقالات پر مشتمل یہ کتاب قارئین کے لیے مفید مطلب بھی ہے اور وقت کی اہم ضرورت بھی۔

مرتبین: خالد محمود، خالد جاوید، صفحات: ۲۴۸، قیمت: ۱۵۰؍روپے

**ناشر: اردو اکادمی، دہلی**